

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

اشارات

گزشتہ ماہ صدر مملکت نے کنونشن مسلم لیگ کی ایک مجلس سے خطاب کرتے ہوئے جہاں اور بہت سی باتوں کا ذکر کیا، وہاں اسلامی قانون کے بارے میں بھی اظہارِ خیال فرمایا اور کہا کہ ہم سب کے لیے اسلام سے زیادہ کوئی چیز اہم نہیں اگر اس ملک میں اسلامی قوانین نافذ ہو سکیں تو ہم سب کو بچھڑا دینا اور خوشی ہوگی۔ لیکن یہ سب کو معلوم ہے کہ یہ مسئلہ نہایت نازک اور پیچیدہ ہے اور اس کے حل کے لیے مزوری ہے کہ علماء و دکتلا اور جج صاحبان عوام کے مشورے سے کوئی ایسا قابلِ عمل مسودہ قانون تیار کر دیں جو تمام فرقوں کے لیے قابلِ قبول ہو۔ اسمبلیاں اس کی منظوری دے دیں تو میں اٹھکیں بند کر کے اس پر دستخط کر دوں گا۔ اور مجھے اس سے زیادہ کسی اور بات سے خوشی نہ ہوگی کہ پاکستان میں مکمل طور پر شرعی قانون کا نفاذ عمل میں آئے۔

صدر صاحب نے اس بیان میں یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ وہ پاکستان میں اسلامی قانون کے نفاذ کے دل و جان سے آرزو مند ہیں۔ بشرطیکہ ملک کے تمام طبقے، مذہبی فرقے اور قانون ساز ادارے کسی مجموعہ قوانین پر سو فیصد متفق ہو کر صدر صاحب کی بارگاہِ عالیہ میں یہ عرض کر دیں کہ حضور ملک کی سو فیصد آبادی اس مسودہ قانون پر مکمل اتفاق رکھتی ہے لہذا اب آپ بھی اس پر صاف فرما کر اس کا نفاذ کر دیں۔

صدر صاحب سے بعد احترام پوچھا جاسکتا ہے کہ کیا دنیا میں کہیں بھی قانون سازی کا یہ انوکھا طریقہ اپنایا گیا ہے؟ اگر قانون کے نفاذ کا یہ طریقہ کہیں بھی رائج نہیں تو آخر اسے اسلامی قانون ہی کے معاملے میں کیوں پیش کیا جا رہا ہے؟ پھر صدر صاحب سے یہ بھی پوچھا جاسکتا ہے کہ کیا آپ نے اپنے پسندیدہ دستور اور اپنے تجویز کردہ قوانین کو اسی طریق سے اپنی شرائط کے ساتھ ملک میں نافذ فرمایا ہے؟ کیا ان کے نفاذ سے پہلے ان کے بارے میں تمام طبقوں سے

استصواب کر کے اس امر کا اطمینان کر لیا گیا تھا کہ ملک کی پوری آبادی ان پر کامل اتفاق رکھتی ہے؛ کیا ان پر علماء اور وکلاء اور جج صاحبان کی مہر تصدیق ثبت کروا کر اس ملک پر مسلط کیا گیا تھا؟ آخر آپ نے اپنے پسندیدہ دستور اور قوانین کے نفاذ میں ان ساری شرائط کو کیوں یکسر نظر انداز کر دیا؟

عوام کے حلقے بلاشبہ کمزور ہوتے ہیں مگر اس کے باوجود ان کی بھی تک اس آمرانہ طریق کے نقوش محفوظ ہیں جس کے مطابق ۱۹۶۲ء کے دستور کا نفاذ کیا گیا۔ اتنی بات تو بہر حال انہیں یاد ہے کہ آپ نے تشکیل دستور کے ابتدائی مراحل سے لے کر اس کے نفاذ تک عوامی احساسات کی کسی مرحلے پر بھی قطعاً کوئی پروا نہ کی اور اپنے ذاتی نظریات دستور کی صورت میں عوام پر ایک حکم کے ذریعے ٹھونس دیئے۔

دستوری کمیشن کو ترتیب دیتے وقت عوام سے کسی قسم کا کوئی مشورہ نہ کیا گیا اور اس بات کی کوشش کی گئی کہ اپنی پسند کے آدمیوں کو اس میں شامل کیا جائے۔ اس کمیشن نے جو سوال نامہ جاری کیا اس کے جوابات پھینچنے کے معاملے میں عوام پر عجیب و غریب پابندیاں عائد کی گئیں۔ ان میں سے ایک پابندی یہ تھی کہ اس سوالنامہ کا جواب دینے میں ایک دوسرے سے مشورہ نہ کیا جائے اور اس کے کسی پہلو پر پبلک میں گفتگو نہ کی جائے بلکہ جن خوش نصیبوں کو یہ سوال نامہ وصول ہو وہ بھی اپنی آراء کو پوری طرح اخصا میں رکھتے ہوئے صرف کمیشن کو اپنے انفرادی خیالات سے آگاہ کریں۔

عوام کے لیے ایک نظام حیات مرتب کیا جا رہا تھا اور وہ بے چارے اس ساری کارروائی سے یکسر بے تعلق تھے۔ انہیں قطعاً علم نہ تھا کہ نوشتہ دستور ان کے لیے کیا فیصلے کر رہا ہے۔

اس کارروائی کو عوام سے پوشیدہ رکھنے کے بارے میں حکومت اتنی چوکس تھی کہ جہاں ذرا بھی کسی نے کشتائی کی وہیں اس سے باز پرس کی گئی۔ بعض افراد پر محض اس لیے مقدمت چلائے گئے کہ انہوں نے دستوری کمیشن کے سوالات کے بارے میں دوسرے افراد سے بات کر ڈالی۔ ان ایام میں حکومت کی پوری مشینری عوام کو دبانے میں غیر معمولی طور پر مستعد رہی۔ ان حالات میں جو دستوری سفارشات اس کمیشن نے مرتب کیں انہیں بھی بڑی حد تک نظر انداز کر کے ایک ایسا دستور تشکیل دیا گیا جس میں اقتدار اعلیٰ بلا شرکت غیرے صرف ایک فرد کے ہاتھ میں ہوا۔

وہی ملک کے پورے سیاہ و سفید کا مالک ہو اور کوئی شخص یا ادارہ اس سے کسی قسم کی کوئی باز پرس نہ کر سکے۔ دستور کی کمیشن نے آئین میں جن جمہوری دفعات کی سفارش کی تھی ان سب کو اس میں سے نکال دیا گیا۔ آئین کمیشن کی تجاویز کو کس منگوانہ انداز کے ساتھ متروک کیا گیا اس کا اندازہ اس کمیشن کے صدر جناب جسٹس شہاب الدین کے حالیہ بیان سے آسانی لگایا جاسکتا ہے جس میں انہوں نے بڑے واضح الفاظ میں اس امر کی صراحت کی ہے کہ ان سفارشات کو قطعاً درخور اعتنا نہیں سمجھا گیا۔ خصوصاً ان کے ان حصوں کو تو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے جن میں صدر مملکت کے اختیارات محدود ہوتے ہوں یا عوام کے سامنے مسئولیت کا سوال پیدا ہوتا ہو۔

یہ امر نہ روش اور عوامی احساسات سے یکسر بے پروائی کا اندازہ تو دین دستور کے مراحل تک ہی محدود نہ تھا بلکہ آرڈی نمنس کی تلوار کے ذریعہ اس کا نفاذ عمل میں لایا گیا۔ اس اہم اور نازک موقع پر کسی طبقہ سے بھی مشورہ کی ضرورت نہ تھی اور یہ ایک یہ قلاوہ لوگوں کی گردنوں میں ڈال دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی متعدد دوسرے آرڈی نمنس بھی نافذ کیے گئے تاکہ ساری قوم کو اچھی طرح جکڑ کر اس پر اس ناروا بوجھ کو لا دیا جائے اور وہ نہ تو جنبش کر سکے اور نہ فرمادہ کر سکے۔ یونیورسٹی آرڈی نمنس اور پریس آرڈی نمنس اس دستور کے لازمی ضمیمہ کے طور پر اس کے ساتھ ہی نافذ کیے گئے تاکہ کسی طرف سے اس کے خلاف کوئی آواز بلند نہ ہو سکے۔ صدر مملکت اپنے دلچسپ نظریات کو تو عوام کی مرضی کے علی الرغم ملک میں اس امر انداز سے نافذ کرتے ہیں، مگر اسلامی دستور کے بارے میں ملک کی سو فیصد آبادی کے مکمل اتفاق کو شرط قرار دیتے ہیں۔ قول و فعل کا اس سے بڑا تضاد اور کہاں دیکھا جاسکتا ہے۔

ان کے اس طرز عمل کو دیکھتے ہوئے یہ سمجھنا کچھ مشکل نہیں کہ انہیں اسلام کے علاوہ کوئی دوسرا دستور عزیز ہے اور وہ اسی کے مطابق امور مملکت چلانا چاہتے ہیں۔ اسلامی دستور کے بارے میں ان کے دل میں مختلف قسم کے شکوک و شبہات ہیں اور اسی بنا پر وہ اس کے نفاذ سے گریزاں ہیں۔ لیکن ان کے خیال میں چونکہ مسلمانوں کو اس مسئلہ سے ایک جذباتی لگاؤ ہے اس لیے وہ کھل کر اس کے خلاف کوئی بات کہنا نہیں چاہتے۔ انہوں نے ایک مرتبہ نہیں بلکہ کئی مرتبہ اسلامی دستور کے بارے میں دیے لفظوں میں اپنے شکوک کا اظہار کیا ہے اور اپنی الجھن کو الفاظ کے پیرچھیرے

کے ساتھ اس طرح بیان کیا ہے کہ ایک نیم مہذب معاشرے کے قوانین کو آج کل کے جدید معاشرے کے لیے کس طرح رہنمائیا جاسکتا ہے۔

انہیں اسلامی دستور و قانون سے کتنی محبت ہے اور وہ اس کے نفاذ کے لیے کہاں تک دل کی گہرائیوں سے آرزو مند ہیں، اس کے اندازے کے لیے کسی لمبی چوڑی تحقیق کی ضرورت نہیں بلکہ اسے سمجھنے کے لیے یہ دیکھنا چاہیے کہ انہوں نے ان دینی مسائل میں بھی عوام کے جذبات کا کہاں تک احترام کیا ہے جن پر پوری ملت کے اندر مکمل اتحاد و اتفاق ہے اور جنہیں فی الحقیقت پوری قوم کے دل کی آواز کہا جاسکتا ہے۔ عائلی قوانین کے خلاف ملک کے سارے مذہبی گروہوں اور فرقوں نے صدائے احتجاج بلند کی۔ کوئی ایک طبقہ بھی ایسا نہیں جس نے مذہبی اساس پر اس کی حمایت کی ہو۔ مگر اس معاملے میں مذہبی طبقوں کا مکمل اتحاد اور ان کا پُر زور احتجاج بھی بالکل صدا بصرا ثابت ہوا۔ اگر مذہبی فرقوں کے درمیان افتراق صدرِ مملکت کے نزدیک اسلامی نظام کی راہ کا سنگِ گراں ہے اور وہ اسی بنا پر اس کے نفاذ میں متامل ہیں تو انہیں کم از کم اسلام کی ایسی تعلیمات کو تو قانون کی حیثیت دینے میں قطعاً تامل نہ کرنا چاہیے جن کے بارے میں قطعاً کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا۔ شراب، قمار، رقص و سرود کی محفلوں کا انعقاد، زنا اور دوسری بے حیائیوں کا استیصال، رشوت ستانی کا قلع قمع، یہ چند مسائل تو ایسے ہیں جن کے بارے میں امت کے کسی طبقہ کے اندر کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا۔ آخر ان پر عمل پیرا ہونے میں کوئی چیز مانع ہے۔

اس ضمن میں ذرا آپ ان سفارشات کے متعلق بھی اپنے طرزِ عمل پر غور کریں جو آپ کی اپنی تشکیل کردہ مشاورتی کونسل نے آپ کی خدمت میں پیش کی ہیں۔ اس کونسل نے سود، شراب، جوعے و درخاشی کے بارے میں نہایت واضح طور پر بعض ایسی تجاویز مرتب کیں جن کی پوری امت نے تائید کی۔ ملک کے اخبارات اس حقیقت پر گواہ ہیں کہ ان امور پر کونسل کی سفارشات کی ہر طبقے نے پذیرائی کی اور کسی ایک کونے سے بھی اختلاف کی کوئی آواز بلند نہ ہوئی لیکن آپ نے ان سفارشات کو بھی یا تو یکسر مسترد کر دیا یا انہیں سرِ دخلنے میں ڈال دیا۔ اس سلسلے میں آپ کی حکومت کی طرف سے مشاورتی کونسل پر یہ پابندی بھی عائد کی گئی کہ وہ اپنی سفارشات کو پبلک کے سامنے نہ لائیں بلکہ انہیں

ذقری کارروائی کے مختلف مراحل میں سے گزار کر دیکھا ڈ آفس کی زینت بنا دیں حکومت کے اس فرمان کی یہی وجہ سمجھ میں آتی ہے کہ آپ کو یہ بات بھی گوارا نہیں کہ آپ کا اپنا قائم کیا ہوا ادارہ بھی کوئی ایسی بات سامنے لاتے جس سے عوام کے دینی احساسات کی ترجمانی ہوتی ہو۔

صدر مملکت جب کبھی اسلامی دستور کا ذکر فرماتے ہیں تو مذہبی فرقوں کے اختلاف کا تذکرہ کچھ اس انداز سے کرتے ہیں گویا کہ ان کے درمیان ساری امت میں افتراق ہی افتراق ہے اور کسی ایک معاملے میں بھی مسلمان ایک دوسرے سے متفق نہیں۔ حالانکہ یہ بات حقیقت کے بالکل برعکس ہے۔ مسلمانوں کے تمام فرقوں کے درمیان اہولوں کی حد تک بے مثال اتفاق پایا جاتا ہے۔ اختلاف جو کچھ ہے وہ فروعات میں ہے۔ صاحب صدر جمہلیا ذہن آدمی غالباً اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہو سکتا کہ دستور اور قانونی تفصیلات میں نمایاں فرق ہے۔ دستور ہمیشہ اصولوں کی بنیاد پر مرتب کیا جاتا ہے اور باقی قانون سازی میں جزئیات طے ہوتی ہیں۔ دستور میں فقہی جزئیات کو سامنے نہیں رکھا جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ قیام پاکستان کے چند سال بعد جب اس اختلاف کو آڑ بنا کر قوم پر لادینی دستور مستط کرنے کی کوشش کی گئی تو ملک کے تمام فرقوں کے نامور علمائے بیٹھ کر حیرت انگیز سرعت کے ساتھ اسلامی دستور کے بنیادی اصولوں بالاتفاق طے کر کے حکومت کے سامنے پیش کر دیئے اور یہ ثابت کر دیا کہ اسلامی نظام سے فرار کے لیے یہ فذر بالکل بے بنیاد ہے۔ ان اصولوں سے ملک کے ہر طبقے نے مکمل اتفاق ظاہر کیا۔ علماء نے اس معاملے میں جن فکری ہم آہنگی کا ثبوت دیا اُسے دیکھتے ہوئے یوں محسوس ہوتا تھا کہ ان میں سے ہر ایک کے ذہن میں اسلامی دستور کا ایک واضح اور غیر مبہم نقشہ موجود ہے جسے بیٹھ کر سب نے صنوف قرطاس پر منتقل کر دیا ہے۔ آج تک ان بنیادی اصولوں کے بارے میں کسی فرقے نے اختلاف کی قطعاً کوئی بات نہیں کہی۔ اسی اجتماع میں علمائے کرام نے یہ بات بھی طے کر دی تھی کہ ملک کا قانون شریعت کی اسی تعبیر پر مبنی ہو گا جسے مسلمانان پاکستان کی اکثریت مانتی ہے اور دلیل مستعد فرقوں کے شخصی معاملات کے فیصلے ان کے اپنے پرسنل لا، یعنی ان کی اپنی فقہ کے مطابق کیے جائیں گے۔ لہذا شریعت کے نفاذ میں مسلمانوں کے مذہبی اختلافات کی بنا پر اگر کوئی رکاوٹ ہو سکتی تھی تو وہ پہلے ہی دور ہو چکی ہے اور انگریزی محاورے کے مطابق علمائے امت نے مخالفین کے بادبانوں سے پہلے مرحلے پر ہی ہوا نکال دی۔ اس بنا پر

لا دینی دستور کی کشتی مذہبی اختلافات کی آڑ لے کر اب آگے نہیں بڑھائی جاسکتی۔ اسے کھینے کے لیے اب کچھ دوسرے بہانے اور عذرات تراشنے کی ضرورت ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کے مذہبی فرقوں کے اختلافات اسلامی نظام کی راہ میں نہ تو کبھی پہلے حائل ہوئے ہیں نہ اب ہو سکتے ہیں۔ اسلامی دستور قریب قریب بارہ صدیوں تک مذہبی اختلافات کے باوجود مسلمان حکومتوں میں نافذ رہا اور ان اختلافات کی بنا پر کبھی بھی اس سے انحراف نہ کیا گیا۔ اس نظام کا اصل مخالفت مسلمانوں کا مغرب زدہ طبقہ ہے جو نہ صرف دینی احساسات اور عوامی جذبات سے یکسر بیگانہ ہے، بلکہ غیر مسئول اقتدار کی چاٹ نے جس کے ذائقہ کو بگاڑ دیا ہے۔ یہ طبقہ شروع ہی سے اس امر کے لیے کوشاں رہا ہے کہ کسی نہ کسی طرح اس ملک میں اسلامی نظام کی جگہ ایک لا دینی دستور نافذ کیا جائے اور اسے اسلام کا گہوارہ بنانے کے بجائے مغربی طرز کی لا دینی ریاست بنا دیا جائے۔ اس ناپاک مقصد کے لیے یہ شروع ہی سے ہاتھ پاؤں مار رہا ہے مگر اسے خدا کے فضل کے علاوہ اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ اس ملک کی عظیم اکثریت نے دین پسند گروہ کی قیادت میں اس کے عزائم کو ہر مرحلے پر ناکام بنا دیا۔ شروع ہی میں جب اس نے لا دینی ریاست کا تذکرہ شروع کیا تو عوام کی طرف سے ایک چار نکاتی مطالبہ پیش ہوا، جس میں حکومت سے یہ تقاضا کیا گیا کہ وہ غیر مبہم الفاظ میں اس بات کا اعلان کرے کہ ملک کا آئین کتاب و سنت کی بنیاد پر مرتب ہوگا۔ اور کوئی قانون اسلامی شریعت کے منافی وضع نہ کیا جائے گا۔ اس مطالبہ نے اتنی قوت اختیار کر لی کہ حکومت کو ۱۹۴۹ء میں قرارداد مقاصد منظور کرنی پڑی۔ ۱۹۵۰ء میں پھر مذہبی فرقوں کے اختلافات کا ذکر کر کے اسلامی دستور کی تشکیل کے کام کو تعطل میں ڈالنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن علماء کرام نے اسلامی آئین کے ۲۲ بنیادی اصول طے کر کے اس مہم کو ناکام بنا دیا۔ ان اصولوں کی حیثیت اجماع کی سی ہے۔ پھر بھی یہ آویزش مسلسل جاری رہی یہاں تک کہ چودھری محمد علی صاحب نے ۱۹۵۶ء میں ملک کے سامنے ایک ایسا دستور پیش کیا، جس میں اچھی خاصی حد تک ۳۱ علماء کرام کے طے کردہ بنیادی اصولوں کو سمونے کی کوشش کی گئی تھی۔ یہ ایک ایسا دستور تھا جس پر ملک کے سارے دین پسند طبقوں نے اطمینان کا اظہار کیا اور اس یقین کے ساتھ اس کی تائید کی کہ اب ملت کے کارواں نے صحیح رخ اختیار کر لیا ہے اور وہ جلد ہی منزل مقصود

کی طرف بڑھنا شروع کر دیکھا۔ اس میں قرآن و سنت کو بطور اساس تسلیم کیا گیا تھا اور حکومت نے اپنے آپ کو اس بات کا پابند بنایا تھا کہ وہ اسلام کے بتائے ہوئے معارفات کو فروغ دے گی اور منکرات کو مٹانے کے لیے مؤثر قدم اٹھائیگی۔ اس میں شہریوں کے بنیادی حقوق بھی متعین کیے گئے تھے اور اسلام کی طرف سے عائد کردہ معاشرتی اور معاشی ذمہ داریوں سے عہدہ براہ کرنے کا بھی وعدہ کیا گیا تھا۔ پھر اس میں اقتدار کو بھی بعض ضابطوں کا پابند بنا کر آمریت کا سدباب کیا گیا تھا۔

جس وقت یہ دستور سامنے آیا اسی وقت سے اسے کالعدم قرار دینے کے لیے مغرب زدہ طبقے نے سازشیں شروع کر دیں اور اسی سازش کے نتیجے میں عام انتخابات سے چند ماہ پیشتر ملک میں مارشل لانا نافذ کر کے اس دستور کا خاتمہ کر دیا گیا۔ صاحب صدر اگر چاہتے تو ۱۹۶۲ء کے نئے غیر جمہوری دستور کی جگہ ۱۹۵۶ء کا دستور بھی نافذ کر سکتے تھے جس پر عوام قریب قریب متفق ہو چکے تھے اور جسے علماء کرام نے بھی قبول کر لیا تھا۔ اگر اس انقلاب کا مقصد محض سابق سیاستدانوں سے ملک کو نجات دلانا تھا تو وہ سابق دستور کو قائم رکھ کر بھی اس کام کو سرانجام دے سکتے تھے۔ لیکن معلوم یہ ہوتا ہے کہ اس بساط کو اٹھانے کا مقصد صرف اس دستور کو ختم کرنا تھا۔ کیونکہ سابق سیاستدانوں کی ایک معقول تعداد کو تو صدر صاحب نے سینے سے لگا لیا ہے مگر ۱۹۵۶ء کے دستور کے جمہوری اور اسلامی عناصر میں سے کسی کو بھی نئے دستور میں راہ پانے کا موقع نہیں دیا۔ اس نئے دستور کا جائزہ لینے سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ یہ دستور اس سابقہ دستور کی ضد میں مرتب کیا گیا ہے اور اس کا مقصد اس کی جمہوری اور اسلامی روح کو ختم کر کے ملک میں آمریت اور مغربیت کو فروغ دینا ہے۔

آج ہمارا ملک جن مصائب سے دوچار ہے اس کی بنیادی وجہ مغرب زدہ طبقے کی یہی بے جا ضد اور سہٹ دھرمی ہے۔ مغربی نظریات اور مغربی تہذیب و تمدن کو تو وہ قوت کے بل بوتے پر اس ملک میں رائج کرنا چاہتا ہے۔ لیکن اسلامی نظام کو جو باشندگان ملک کی عظیم اکثریت کا متفقہ مطالبہ ہے اور جس کی خاطر پاک و ہند کے مسلمانوں نے بے مثال قربانیاں دے کر ایک انگ خطہ ارضی حاصل کیا ہے، اسے وہ مختلف جیلوں بہانوں سے برابر مال رہا ہے۔

اس باہمی رشتہ کشی کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ملک میں ابھی تک کوئی ایسا دستور نافذ نہیں کیا جا سکا جسے یہاں کے عوام نے خوشدلی کے ساتھ قبول کر کے اس کے مطابق تعمیر نو کا کام شروع کیا ہو۔ مغرب زدہ طبقتوں نے یہاں ہر گراہی کو برداشت کیا بلکہ اُسے بڑھنے اور پھلنے پھولنے کے پورے مواقع فراہم کیے۔ مگر اسلام کی راہ میں ہمیشہ رکاوٹ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اس غیر دانشمندانہ طرز عمل کے نتائج سب کے سامنے ہیں۔ یہاں نہ تو لادیمتیت ہی پوری طرح مسلط ہو سکی ہے اور نہ اسلامی نظام ہی قائم ہوا ہے۔ شروع سے ملک میں تعطل اور بے یقینی کی ایک فضا چلی آرہی ہے۔

حکمران طبقے اور عوام کو اس باہمی کشمکش میں مصروف دیکھ کر اور نظر باقی اعتبار سے میدان خالی پا کر اسلام دشمن عناصر نے حکومت کی محافظت میں بلکہ اس کی تائید کے ساتھ غیر اسلامی نظریات کا پرچار شروع کیا اور اس کے عبرتناک نتائج بھی اب کھل کر عوام کے سامنے آگئے ہیں۔ غیر اسلامی قوتیں اب اتنی دلیر اور جری ہو گئی ہیں کہ اس خطرہ پاک میں علانیہ اسلام مردہ باد کے نعرے بلند کیے گئے ہیں۔ بعض لوگ اب اپنی مصلحتوں کی بنا پر اس بات کا انکار کر رہے ہیں کہ یہ نعرہ بلند نہیں کیا گیا تھا۔ مگر کراچی میں سینکڑوں سننے والے کان اس کے گواہ ہیں اور سینکڑوں دیکھنے والی آنکھیں ان لوگوں کو پہچانتی ہیں جنہوں نے یہ نعرے بلند کیے تھے۔

اس وقت ہم اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے کہ یہ نعرے کسی سوچی سمجھی اسکیم کے تحت بلند کیے گئے یا یہ چند شوریدہ سرنوجوانوں کے وقتی جوش و خروش کا نتیجہ ہیں۔ اس سارے معاملے میں دیکھنے کی بات یہ ہے کہ حکومت کی غلط روش نے معاملات کو کس حد تک بگاڑ دیا ہے۔ مارشل لا کے نفاذ تک اسلام دشمن عناصر اسلامی نظام کے احیاء کی کوشش دیکھ کر بڑے پیچ و تاب کھاتے رہے۔ چونکہ پریس ان کے ہاتھ میں تھا اس لیے مختلف انداز سے اس نظام کے بارے میں عوام کے ذہنوں میں شک و شبہات بھی پیدا کرتے رہے۔ مگر آج تک ان عناصر کو یہ جرأت نہ ہوئی تھی کہ وہ اسلام کے خلاف کھل کر کوئی بات کریں۔ ان کے غیظ و غضب کا ہدف علامتے دین (ان کی اصطلاح میں "ملا") تھے۔ وہ ان پر برستے رہے اور عوام کو یہ تاثر دیتے رہے کہ وہ حقیقت میں اسلام کے خلاف نہیں بلکہ اسلام کی اس تعبیر کے خلاف ہیں جو مولوی پیش کرنا ہے۔ یگر اب بتی تھیلے سے باہر آچکی ہے اور جو لوگ اس معاملے میں کسی خوش فہمی میں مبتلا تھے انہیں معلوم ہو چکا ہے کہ یہ لوگ اسلام کے کتنے خیر خواہ اور

اس سے کس قدر محبت کرنے والے ہیں، اور انہیں اللہ کا دین کارل مارکس، لینن اور ماؤ کے دین کے مقابلے میں کتنا عزیز سمجھا۔

ان لوگوں کے کام کرنے کا تکنیک بڑا گہرا اور عیارانہ ہے۔ یہ متعدد گروہوں میں بٹ کر معاشرے میں مزیت کرتے ہیں۔

ایک گروہ آمرانہ اقتدار کے گرد جمع ہو کر اس کا اعتماد حاصل کر لیتا ہے، اور چونکہ اقتدار عوامی تائید سے محروم ہے اس لیے اسے ہر قدم پر اس بات کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ کوئی بند بانگ گروہ اس کی تعریف و توصیف کرے اور اس کی غلطی اور احمقانہ پالیسیوں کو سر لہے۔ یہ گروہ آگے بڑھ کر اس کی اس ضرورت کو پورا کر دیتا ہے۔ یہ ایک طرف اسے برابر یہ باور کرانا ہے کہ تم ایک بڑے کامیاب حکمران ہو، تمہارا اقبال دن و گنی سات چو گنی ترقی کر رہا ہے۔ چند رجعت پسند لوگ تمہیں خواہ مخواہ بدنام کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ مگر تمہیں ان کی کوئی پروا نہ کرنی چاہیے بلکہ انہیں سختی سے دبا دینا چاہیے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ ایک توفیق کے زور سے احمقانہ کی ہر آواز کو دباتا ہے اور دوسرے ان لوگوں کے بھرتے میں آکر من مانی کارروائیاں کرتا ہے۔ یہ لوگ اس صورت حال سے فائدہ اٹھا کر اقتدار کو عوامی احساسات سے بالکل بے تعلق بنا دیتے ہیں۔ جلد ہی ایک وقت ایسا آ جاتا ہے کہ اسے عوام کے جائز مطالبات میں بھی شورش اور سماج دشمن سرگرمیوں کا عکس نظر آنے لگتا ہے اور وہ ہر اس بات کو اپنے خلاف سازش سمجھ بیٹھتا ہے جو اس کی حمایت کے سوا کہی گئی ہو۔ وہ عوامی مطالبے کو خواہ وہ کتنا ہی معقول کیوں نہ ہو پاتے استعمار سے ٹھکراتا ہے اور ہر جائز مسئلے کو اپنے وقار اور حکومت کے وقار کا مسئلہ بنا کر دبانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس طرح عوام سے بے تعلق آہستہ آہستہ عوام دشمنی کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور خواہ تقریروں میں اپنے آپ کو عوام کا خادم ہی ظاہر کیا جائے مگر دنیائے عمل میں ان کے ساتھ دشمنوں کا سا سلوک کیا جاتا ہے۔ اس سارے ڈرامے میں اس اسلام دشمن گروہ کی صرف یہ کوشش ہوتی ہے کہ ہر اقتدار طبقہ ہمیشہ عوام کے خلاف صفت آرا رہے۔ اس فضا میں ملک کے اندر جبر و استبداد کا بڑھنا ایک فطری امر ہوتا ہے۔ پھر حکومت کی غلط بخششوں کی وجہ سے معیشت کا توازن بھی بگڑتا ہے۔ قومی دولت کا بیشتر حصہ ایک مختصر سے طبقے کے اندر محدود ہو کر رہ جاتا ہے۔ اور اکثریت زندگی کی ابتدائی ضروریات سے محروم ہو جاتی ہے۔ بلکہ

اُسے نان جو بھی میسر نہیں آتی جس سے وہ جسم و روح کے رشتہ کو قائم رکھ سکے۔

دوسرا طبقہ اپنے پیسے کا لم کی اس تدبیر سے فائدہ اٹھا کر امیری وغیرہ کی لڑائی کے محاذ پر کام شروع کرتا ہے اور نہایت ہوشیاری کے ساتھ جگہ جگہ کے طبقے کے خلاف عوامی نفرت اور حقارت کے جذبات کو اُن اقدار کے خلاف اُبھارنے میں مصروف ہو جاتا ہے جو اس قوم کی انفرادی و اجتماعی زندگی کا سرمایہ ہیں، تاکہ قوم اپنے ماضی سے کٹ جائے، اپنے افکار و نظریات سے رشتہ منقطع کر لے، اپنے دین اور ایمان سے تہی دست ہو کر فکر و احساس کے اعتبار سے بالکل آوارہ ہو جائے، یہاں تک کہ اشتراکیت کے تھپیڑے اسے جس طرف چاہیں بہا کر لے جائیں۔ یہ طبقہ سرمایہ داری کے زخم خوردہ لوگوں کا چارہ ساز بن کر سامنے آتا ہے اور انہیں اس بات کا یقین دلاتا ہے کہ وہ اس کے دکھوں کا مداوا کرنا چاہتا ہے۔ پھر جب وہ ان کا اعتماد حاصل کر لیتا ہے تو بڑی چالاک کے ساتھ ان کے اندر الحاد کا پرچار کرتا ہے اور ان کے ریتے ہوئے زخموں پر دستِ تفرار کرنے کے بجائے ان کے دل و دماغ میں اشتراکیت کے جراثیم اتارنا ہے۔ وہ انہیں اس فریب میں مبتلا کرتا ہے کہ سرمایہ داری بڑا دھن ایک ہی ہے۔ اور سرمایہ داری کی وجہ سے تم جن مسائل میں گرفتار ہو وہ درحقیقت دین کے ساتھ وابستگی کے طبعی نتائج ہیں۔ دین استحصال اور لوٹ کھسوٹ اور کمزوروں پر ظلم و زیادتی کا علمبردار ہے۔ اور دین دار طبقے سرمایہ داروں کے ایجنٹ ہیں۔ ان نظریات کو بڑے سلیقے اور چالاک کے ساتھ منظم طبقوں میں پھیلایا جاتا ہے اور وہ ان باتوں سے متاثر ہو کر یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ان کے حقیقی خیر خواہ دین کے حامی طبقے نہیں بلکہ اشتراکیت کے رہنما ہیں، اور ان کی اصلاح حال کی کوئی صورت بجز اس کے ممکن نہیں کہ اشتراکیت کو اپنایا جائے اور دین اور اس کے ماتھے والوں کا خاتمہ کیا جائے، کیونکہ ”رحبت پسند“ ہونے کی وجہ سے یہ لوگ ان کی معاشی فلاح کی راہ میں حائل ہیں۔

سرمایہ داری اور جاگیر داری کو یہ اشتراکیت خود کس قدر لعنت سمجھتے ہیں اور اسے انسانیت کے لیے کس حد تک تباہ کن خیال کرتے ہیں، اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس ملک میں سرخ فوج کے نامور سپہ سالاروں کی عظیم اکثریت ان لوگوں پر مشتمل ہے جو خود بڑے بڑے سرمایہ دار اور کارخانہ دار اور جاگیر دار ہیں۔ جن کی اپنی زمینوں اور

کارخانوں میں مزارعین اور مزدوروں کا خون پورے جبر و استبداد کے ساتھ چوسا جاتا ہے۔ غریبوں اور ناداروں کے ان بھی خواہوں کے زیر اثر کام کرنے والے اپنے آپ کو اپنی ٹھکانا اور اپنی ٹھکانوں اور انہی مظالم کا شکار پاتے ہیں جن کی وجہ سے سرمایہ داری کو قابل نفرت کر دیا جاتا ہے۔ سرمایہ داری ہمارے نزدیک واقعی ایک لعنت ہے جس کا خاتمہ ضروری ہے۔ معاشرے میں معاشی عدل و انصاف فی الحقیقت انسانیت کی بنیادی ضرورت ہے۔ ہمیں یہ بھی تسلیم ہے کہ سرمایہ پرستی اور معاشی ناہمواری نے عوام کی زندگیوں کو ایک دردناک خذاب بنا دیا ہے۔ مگر ہم اسے دنیا کا سب سے بڑا فریب سمجھتے ہیں کہ جو لوگ خود سرمایہ دار اور جاگیر دار ہیں وہ اشتراکیت کے علمبردار بن کر اٹھیں اور عوام کو یقین دلائیں کہ ان کے دکھوں کا مداوا اسلام کے ذریعہ سے نہیں بلکہ اشتراکیت کے ذریعہ ہی سے ہوگا۔ ہم اسے عوام کی سپردی کے بجائے دین کے خلاف ایک سازش سمجھتے ہیں۔ اشتراکی ممالک اور اشتراکی سرمایہ داروں کی جو کارروائیاں اب تک منظر عام پر آئی ہیں انہیں دیکھ کر بھی اس بات کا پختہ یقین ہو جاتا ہے کہ اس کو یک کا اولین مقصد اسلام کے خلاف بغاوت ہے۔

اس ملک میں اشتراکیت کا دم بھرنے والے آخر کتنے ایسے جاگیر دار اور سرمایہ دار ہیں جنہوں نے اپنے عمل سے اپنے خلوص کا ثبوت دیا ہو اور اپنی زمینوں اور کارخانوں اور اپنے سرمائے کو اپنے مزارعین اور مزدوروں اور غریبوں میں تقسیم کر دیا ہو؛ یا کسی اشتراکی سرمایہ دار نے قومی فلاح و بہبود یا مزدوروں اور مزارعین کی بہتری کے لیے کوئی اولیٰ ہسپتال یا مکتب قائم کیا ہو؛ آخر کیا وجہ ہے کہ ان لوگوں کی ساری توجہ مذہب اور مذہبی طبقوں کے خلاف نفرت پھیلانے ہی میں صرف ہوتی ہے اور خستہ سال طبقوں کے مصائب و دور کرنے کے لیے عملی طور پر ایک قدم بھی نہیں اٹھایا جاتا؛ کیا یہ تعاقب اس حقیقت کی غمازی نہیں کرتے کہ اشتراکیت کی اصل دشمنی سرمایہ داری سے نہیں بلکہ مذہب سے ہے؛ اور غریبوں اور مزدوروں کی نسبت محض ایک ڈھونگ ہے جس کے پیچھے اسلام دشمنی کا مذموم جذبہ پوری قوت سے کار فرما ہے؟

کتنے ہی ممالک ایسے ہیں جن میں اشتراکی انقلاب آیا اور کتنے ہی معاشرے ایسے ہیں جنہیں اشتراکیت نے زیر کر لیا۔ ان سب میں مذہب اور خاص طور پر اسلام کا جو حشر ہوا وہ اس تجربے کے فلاح اور مقصد و منہاج کو سمجھنے